ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.8,Issue No.3 (2026)
(July to September)

مراجعت: اجنبیت اور دوہری اذیت کا قصہ

Ignorance: A Tale of Alienation and Double Torment

ڈاکٹر ظہیر عباس
اسسٹنٹ پروفیسر، ادارہ زبان او ادبیات اُردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Dr. Zaheer Abbas
Assistant Professor, Institute of Urdu Language & Literature, University of the Punjab, Lahore.
zaheer.iull@pu.edu.pk

Abstract: Migration is a topic that has been written about for ages in world literature. Humans inevitably go through this experience, sometimes voluntarily and sometimes under compulsion. Forced migration is undoubtedly a painful process. A novelist usually makes the hardships of migration the subject of discussion. There are very few writers who write about the experiences of return. The journey of return is always difficult. It is not easy to settle down again in places that you have left ages ago. Milan Kundera's novel Ignorance, which we have discussed in this article, beautifully describes the experience of migration, how our own land and the people who live there become strangers to us. No one wants to hear the story of the main characters of this novel during their time of migration. Thus, they remain strangers among their own land and people. This novel explains in detail the difference between migration and return life and attempts to reach the conclusion that until people who have gone through similar experiences meet, no one can understand the suffering of another.

Key words: Ignorance, Alienation, Edward.W. Said, Lonliness, Imperialism, Kundera's novel, the experience of migration

سفر روزاول سے انسانی تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے۔ سفر زندگی کا جوہر ہے۔ انسان، حیوان اور چرند پرند ہر زندہ وجود ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر لازمی کرتا ہے۔ انسان کی خواہش سفر کی راہ کھوٹی نہیں کرتی۔ ایک صحت مند انسان اپنی زندگی میں ہزاروں میل کا سفر کرتا ہے۔ سفر اگر خوشگوار ہے، انسان اپنی مرضی سے کسی دباؤ کے بغیر کرتا ہے تو یہ ایک عام اور معمول کی کارگزاری ہے لیکن اگر یہ کسی خارجی یا باطنی دباؤ کے نتیجے میں رونما ہو رہا ہے تو غیر معمولی اور معنی خیز ہے۔ زبانی بیانیے کی دنیا میں، یہ دریافت کا عمل ہے۔ انسان کے پاس وقت کی فراوانی ہے سو وہ اسے بے دریغ استعمال کرتا ہے اور واپسی پر کئی کہانیوں کا خزانہ اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایسا سفر جو بقا کی مجبوری کے تحت کیا جائے، اذیت ناک تجربہ بن جاتا ہے جو مسافر کے لیے ناسور بن جاتا ہے۔ عہد جدید میں انسان جس نوعیت کے سفر درپیش رہے ہیں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ ہم بہت تفصیل میں نہیں جاتے۔ بیسویں صدی میں انفرادی اور اجتماعی سطح ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے تجربات اپنے اندر ہزار ہا کہانیاں رکھتے ہیں۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگ نے انسان کے ساتھ جو سلوک کیا، اس سے کون واقف نہیں ہے۔ پھر ہمارے ہاں تقسیم ہند کا وقوعہ، اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والی مہاجرت اور اس سے جڑی کہانیاں آج بھی اپنی آخری سانسیں لے رہی ہیں۔ جارج اسٹائنر کے نزدیک بیسویں صدی کو "ماورائے ارضی" مہاجرت کے عہد کی علامت سمجھتا ہے(۱) گویا بیسویں صدی نے انسان کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ جبری اور اختیاری ہر

دو صورتوں میں انسان مہاجرت کا تجربہ جھیلتا ہے۔ سفر کے جدید ترین ذرائع اس معاملے میں انسان کی معاونت کرتے ہیں۔ اب انسان موت کو چکما دے کر جلاوطن ہو سکتا ہے اور مہاجرت کے اذیت ناک تجربے کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے۔ ایڈروڈ سعید کا یہ کہنا بجا طور پر مہاجرت کے تجربے کا بہترین عکاس ہے:

> "Exile is strangely compelling to think about but terrible to experience.it is unhealable rift between a human being and a native place,between the self and it's true home:its essential sadness can never be surmounted."(2)

گویا یہ مہاجر اور اس کے ٹھکانے کے درمیان ایک ایسی دراڑ کا نام ہے جو وقت کے ساتھ مزید گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا وجودی تجربہ ہے جو اظہار کے دائرے میں نہیں آتا۔ کسی بھی مہاجر کے لیے مہاجرت کا زمانہ اتنا اذیت ناک نہیں ہوتا جتنا مراجعت کے تصور اور مراجعت کا ہوتا ہے۔ واپسی کا سفر ہمیشہ زیادہ کٹھن ہوتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد دونوں اطراف کے مہاجر اپنے اپنے ٹھکانوں کو پلٹنے کے لیے تڑپتے رہے اور جو کوئی جنم بھومی کو دوبارہ دیکھ آیا وہ کبھی پہلے جیسے نہ رہا۔ جو ٹھکانے ہماری یادوں میں، ہمیشہ ہمارے ساتھ تر و تازہ رہتے ہیں۔ جنھیں ہم شعوری کوشش کر کے اس آس پہ زندہ رکھتے ہیں کہ کبھی ہم جائیں گے اور دیکھ آئیں گے۔ اگر زندگی میں کبھی ان ٹھکانوں کو پلٹنے کا، دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے تو ہمارے ہاتھ سوائے مایوسی اور دکھ کے کچھ نہیں آتا۔ وہ ٹھکانے جو ہماری یادوں میں جامد ہو چکے ہوتے ہیں، ہماری غیر موجودگی میں پھل پھول کر، منہدم ہو کر، جگہیں بدل کر کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ واپسی کے سفر میں ہر شے ہمیں سرے سے پہچاننے ہی سے انکار کر دیتی ہے۔ وہاں کے لوگوں کے چہرے بدل چکے ہوتے ہیں۔ سارا منظر ہی تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔ حالت کچھ یوں ہوتی ہے۔

واپس نہ جا وہاں کہ تیرے شہر میں منیرؔ
جو جس جگہ پہ تھا وہ وہاں پر نہیں رہا

وہ جگہیں جہاں ہم نے اپنا بچپن اور جوانی کے دن گزارے ہوتے ہیں، منہدم ہو چکی ہوتی ہیں یا وہاں نئے مکان بن چکے ہوتے ہیں۔ وہاں کے باسیوں کو ہم جس عالم میں چھوڑ آتے ہیں، ہم سمجھتے ہیں جب کبھی مراجعت ہو گی انھیں ویسا ہی پائیں گے لیکن ان کے چہرے بدل چکے ہوتے ہیں۔ مانوسیت، اجنبیت میں بدل چکی ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ مر کھپ چکے ہوتے ہیں۔ ہم جس جگہ موجود ہوتے ہیں، زندگی کر رہے ہوتے ہیں وہاں، وقت کی تثلیث سے ہم آگاہ ہوتے ہیں، جو کچھ ہم پیچھے چھوڑ آتے ہیں وہ ہمارے لیے مکمل ماضی ہوتا ہے۔ ہمارے وقت کے تصور سے جدا۔ مہاجر جب ماضی کی یادیں کھوجتا ہوا واپس پلٹتا ہے تو وہ اپنی زندہ یادوں کو دفن کر کے وہاں سے نکلتا ہے۔ اس آفاقی موضوع پر دنیا بھر میں بیسیوں فن پارے مل جائیں گے۔ تحریری بیانیوں میں اس کی اولین مثال ہومر کی شہرہ آفاق نظم "اوڈیسوس" ہے جس میں ہیرو ہر صورت اتھاکا پہنچنا چاہتا ہے۔ مراجعت کے بیس سال ذہنی و جسمانی توڑ پھوڑ اور ریاضت کے سال تھے۔ واپسی کا سفر امید، تجسس اور سرخوشی کے علامت تھا لیکن سفر کا انجام باطنی تنہائی اور اتھاہ بے توجہی پر ہوا۔ مراجعت کے حوالے سے بیس کا ہندسہ بہت معنی خیز ہے۔ بیس سال میں ایک پوری نسل تیار ہو جاتی ہے۔ عالمی ادب میں مراجعت کے حوالے سے بیس سال کا پہلا حوالہ تو ہومر کی "اوڈیسوس" ہے جب کہ اس کے علاوہ دو شہرہ آفاق ناول بھی لکھے گئے۔ معروف فلسطینی ناول نگار غسان کنفانی کا ناول "حیفا کی طرف واپسی" مرکزی کردار سعید اور اس کی بیوی صفیہ کی حیفا اپنے تباہ حال گھر کی طرف

واپسی۔ اسرائیلوں کی اچانک اور تباہ کن بمباری انھیں اپنے گھر سے جان بچا کر بھاگنے پر مجبور کر دیتی ہے اور افراتفری میں وہ اپنا بیٹا وہاں کھو آتے ہیں جو بیس سال بعد ان کے تئیں مر کھپ چکا ہو گا۔ رام اللہ سے سفر کرتے ہوئے جب وہ حیفا میں داخل ہوتے ہیں تو بدلی ہوئی دنیا دیکھ کر، جو اب ان کے لیے مکمل طور پر اجنبی ہو چکی ہے، ان کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکلتا ہے "یہ ہے حیفا، بیس برس بعد۔۔" یہ ہے حیفا، اے صفیہ "۔(۳) اپنے ہی وطن میں جبری جلاوطنی اور پھر یوں واپسی جیسے اجنبی سرزمین سے اجنبی دنیا میں آئے ہوں۔ وہ جگہیں جہاں پلے بڑھے، اجنبی ہو گئیں، چہرے بدل گئے اور یہ اندازہ ہی نہیں ہوا کہ خود کتنے بدل کر بدلی ہوئی جگہ پر واپس آئے۔

اس کے علاوہ میلان کنڈیرا کا ناول "مراجعت" ہے۔ یہ ناول "Ignorance" کے عنوان سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ فرانسیسی سے اس ناول کا ترجمہ انگریزی میں لنڈا آشر نے کیا۔ حمید رازی نے اسے اردو کے قالب میں "مراجعت" کے عنوان سے ڈھالا۔ یہ مضمون اسی ترجمے کی بنیاد پر لکھا گیا ہے۔ اپنی بنائی ہوئی دنیا میں کنڈیرا سابقہ ناولوں، تخلیقی فن پاروں اور فلسفیانہ دنیاؤں سے اکتساب کرتا ہے۔ یہ صورت اس کے ہر ناول میں نظر آجاتی ہے۔ وہ ناول کی دنیا میں، معاشرتی انسان، تخلیقی فنکار اور فنکار کے ہاتھوں خلق ہونے والے کرداروں کو ایک کڑی میں پرو دیتا ہے۔ کنڈیرا کا دوسرا اختصاص چونکہ ایک ادبی نقاد ہونا ہے لہذا وہ ناول کی دنیا میں فن کی تفہیم کا سامان بھی کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا ناول کا موضوع بھی پراگ سے مہاجرت اور مہاجرت کے مسائل ہی ہے فرق یہ ہے کہ اس ناول میں مہاجرت سے ایک قدم آگے بڑھ کر وہ مراجعت کی اذیت ناکی اور انسانی باطن میں اس تجربے کے نتیجے میں رونما ہونے والی وجودی تبدیلیوں پر بحث کرتا ہے۔ ناول بیس سال پہلے پراگ سے مہاجرت کر کے آنے والی ارینا کی واپسی کے سوال سے شروع ہوتا ہے۔ اس ناول میں وہ ہومر کے لافانی کردار اوڈیسیوس کی وطن واپسی کا حوالہ دیتا ہے کہ کیسے وہ مہاجرت کے زمانے میں کیلپ جیسی اپسرا کی محبت میں گرفتار ہوا پھر وہ اپنی مٹی اور اپنی محبوب بیوی کی طرف لوٹنا چاہتا ہے اگرچہ اس کی بیوی پستہ قامت، کم خوبصورت اور کم عقل بھی ہے لیکن وطن کی بو باس اسے اپنی طرف کھینچتی ہی رہتی ہے۔ جلاوطنی ایک مستقل کیفیت کا نام ہے۔ اپنی مٹی سے جدائی، غیر زمین پر جب جب آپ قدم رکھتے ہیں، اپنی یاد دلاتی ہے۔ غیر ملک کی زمین آپ سے ہم کلام ہوتی ہے اور آپ کو ہمہ وقت یہ احساس دلاتی ہے کہ زمین آپ کی نہیں۔

یہاں جتنے بھی مہاجر آباد ہیں وہ ایک جیسے ہی خواب دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سن سب کا تعلق پراگ سے ہے، یہ سبھی ایک ہی طرح کے تجربات سے گزر کر یہاں تک آئے ہیں۔ غیر جگہ پر کم و بیش ان سب کو ایک ہی طرح کے مسائل کا سامنا ہے گویا ان کی شعوری دنیا کے ساتھ باطنی دنیا میں بھی مماثلت ہے۔ ارینا بھی انھی لوگوں کی طرح ہے۔ شروع شروع میں جب اسے خواب آتے اور وہ دوسروں سے ان کا تذکرہ کرتی اور جواب میں اسے بھی یہی سننے کو ملتا تو اسے اچھا لگتا کہ ہم لوگوں میں کتنی ہم آہنگی لیکن پھر اسے الجھن ہونے لگی کہ خواب جو انسان کا نجی معاملہ ہے ایک اجتماعی واقعہ کیسے بن سکتا ہے۔ ہجرت ایک اجتماعی تجربہ ہے۔ مہاجر ایک دوسرے کے ساتھ اپنے اپنے تجربات اور احساسات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ رات بستروں پر پڑے ہوئے وہ دن بھر کی گفتگوؤں اور اپنی جنم بھومی کے بارے میں سوچتے سوچتے سو جاتے ہیں۔ سوچیں نیند کے عالم میں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں سو وہ سوتے جاگتے ایک طرح کی کیفیت میں رہتے ہیں۔ ماحول، کام کاج اور گزر بسر گوشت پوست کے ہم جنسوں کی طرح لیکن وہ ذہنی اور روحانی طور پر انھیں جگہوں میں ہوتے ہیں جہاں سے انھیں مہاجرت پر مجبور کیا گیا یا انھی مجبوری کے تحت نکلنا پڑا۔

ارینا جو بیس سال سے یہاں موجود ہے۔ بڑی ریاضت سے مہاجرت کی زندگی کو قبول کیا ہے۔ ماضی سے اپنا ناطہ توڑنے میں کافی حد تک کامیاب ہو چکی ہے۔ ناسٹلجیائی صورت حال میں رہنے کی وجہ سے لمحہ موجود کی زندگی وبال بن جاتی ہے اسی لیے ارینا خود کو ہر ممکن طریقے سے پر سکون رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اپنے ذہن کو پراگ کی طرف پلٹنے نہیں دیتی۔ وہاں اس کی ماں موجود ہے لیکن اس کے ذہن میں اسے ملنے کا کبھی خیال نہیں آتا اور نہ ہی کسی سے وہ اس کا ذکر کرتی ہے۔ اجتماعی دکھ، انفرادی اذیتوں کو نگل جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ قریبی عزیزوں کو پیچھے چھوڑ آنے والوں کے پاس ان سے بظاہر بے نیاز ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا، کیوں کہ اگر وہ انھی کی یادوں میں رہیں گے تو لمحہ موجود ان کے لیے عذاب بن جائے گا۔ یہی حکمت عملی ارینا اپناتی ہے گویا وہ خود کو ایک طلسم میں قید رکھتی ہے جہاں ماضی کا گزر نہیں ہے۔ وہ تو طلسم اس روز ٹوٹتا ہے جب اس کی ماں اچانک اسے ملنے چلی آتی ہے۔ اسے ماں کی آمد کی بالکل خوشی نہیں ہوتی کیوں کہ ماں اس ماضی کے ساتھ آئی ہے جس سے وہ پیچھا چھڑانے کے جتن کرتی آئی ہے۔ اس کی حالت وہی ہے جو "خندہ اور فراموشی کی کتاب" میں کرل کی ہوتی ہے۔ ماں اگرچہ کچھ روز ٹھہر کر چلی جاتی ہے لیکن پراگ اور اس کی موجودہ زندگی وہیں چھوڑ جاتی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کی ماں پراگ کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتی لیکن پراگ کو ساتھ ضرور لے آتی ہے۔ بچپن کی زندگی، یادیں اور مہاجرت کا کرب مہاجرت کی زندگی میں زہر گھول دیتا ہے۔ کنڈیرا کے دوسرے ناولوں کے نسوانی کرداروں کی طرح وہ بھی پراگ کے لیے تڑپ اٹھتی ہے، لیکن اس کے باوجود خود پر قابو رکھتی ہے۔ کنڈیرا اس ناول میں جس کہانی کی بنیاد پر قصہ آگے بڑھاتا ہے وہ دراصل اوڈی سس ہے۔ جو تقدیر کا مارا ہوا ہے۔ اس اذیت کے دوران میں اس کا ایک دوست گستاف یہ اعلان کرتا ہے کہ اس کی فرم اپنا ایک دفتر پراگ میں کھول رہی ہے، اس کے نزدیک یہ ارینا کے لیے ایک خوش کن خبر ہو گی لیکن وہ پراگ کو اپنا شہر ماننے سے سرے ہی سے انکار کر دیتی ہے۔ "خندہ اور فراموشی کی کتاب" کی تمینا کی طرح وہ بھی ماضی سے پیچھا چھڑا چکی ہے۔ تمینا" بھی اپنی سابقہ زندگی کو مکمل طور پر فراموش کر چکی ہے۔ فراموشی کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی سے بھی اپنے ماضی کا ذکر نہیں کرتی۔ وہ اپنی مادری بولی کا کسی سے استعمال نہیں کرتی۔ جب آپ اپنی زبان بولنا چھوڑ دیتے ہیں تو گویا آپ کا ماضی غیر محسوس طریقے سے منہدم ہوتا چلا جاتا ہے۔" (۴) تمینا کے ساتھ بھی ایسی ہی صورت حال پیش آتی ہے۔ سو جب ارینا گستاف کو انکار کرتی ہے تو در حقیقت یہ انکار نہیں بلکہ پراگ سے فرار کی موہوم کوشش ہے۔ گستاف سے اس کی ملاقات ویسے ہی ہوتی ہے جیسے کنڈیرا کے ناول "پہچان" میں شونتال کی ژوں مارک سے ہوتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ شونتال مطلقہ ہے جب کہ ارینا بیوہ ہے۔ یوں تو کنڈیرا کے پراگ سے متعلق ہر ناول کا مرکزی شہر پراگ ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے پراگ جدائی، جبر، مہاجرت اور ناسٹلجیئے کا استعارہ ہے۔ یہ ناول باقی ناولوں سے ان معنوں میں منفرد ہے کہ اس کا موضوع مہاجرت نہیں مراجعت ہے۔ اب ارینا مہاجرت کی زندگی میں خوش اور مطمئن ہے۔ اطمینان کی اس سطح پر وہ بہت ریاضت سے پہنچی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو بدترین حالات میں بھی اثبات کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ لیتے ہیں۔

> "اس نے نقل مکانی کو ہمیشہ بد بختی سے تعبیر کیا تھا لیکن اب اسے حیرت ہوتی تھی کہ کیا بد بختی محض دھوکہ تھی؟ کیا لوگ اسے یونہی المیہ سمجھتے تھے؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ اپنی زندگی کی توجیح لوگوں کی دی ہوئی ہدایات کی روشنی میں کر رہی تھی؟ اس نے سوچا اگرچہ نقل مکانی اس کی مرضی کے بغیر تھوپی گئی تھی

لیکن یہ شاید اس کی زندگی کا حاصل تھی۔ تاریخ کی بے رحم قوتوں نے اس کی
آزادی پر حملہ کیا تھا لیکن اسے آزادی عطا بھی کی تھی۔"(۵)

وہ اپنی اس آزادی کو کسی صورت تج دینے کو تیار نہیں تھی لیکن حالات نے اس کے وجود میں اتھل پتھل مچادی۔ ماضی کو دبایا جاسکتا ہے، اس کے ذکر میں کمی لائی جاسکتی ہے، حال کو فراریت کا ذریعہ بنا سکتا ہے لیکن انسان جن راستوں سے گزر کر لمحہ موجود تک پہنچتا ہے، وہ راستے اس کا ہمیشہ پیچھا کرتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں جب پراگ کا ذکر بار بار ہو رہا ہے اوپر سے اس کی دوست سائیلوی اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ پراگ جائے وہاں کی مابعد روسی سامراجیت زندگی بہت مسحور کن ہے۔ جب وہ پراگ جا پہنچتی ہے تو وہاں سب کچھ بدل چکا ہے۔ کنڈیرا یہاں اس ناول کے دوسرے کردار اوڈی سیوس کی واپسی کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب وہ واپس اتھاکا پہنچا تو وہاں کے لوگوں نے اسے اس خوش دلی سے خوش آمدید نہیں کہا جس کا گمان لے کر اس نے واپسی کا سفر کیا تھا۔ اتھاکا کے لوگوں نے اسے اپنی یادوں میں زندہ ضرور رکھا لیکن وہ ناستلجیا کا شکار نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی جنم بھومی کو نہیں چھوڑا وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی قربت میں رہے۔ کہانی سنانے کے لیے اوڈی سیوس کے پاس تھی لیکن سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اسی صورت حال کا سامنا ارینا کو کرنا پڑا کیوں کہ مہاجر وہ بنی تھی۔ بیس سال اس نے وطن سے دور گزارے تھے۔ کہانی اس کے پاس تھی۔ مراجعت کے بعد اگر مہاجر کی کہانی نہ سنی جائے تو نفسیاتی توڑ پھوڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔ مہاجرت کس بنا پر ہوتی ہے اس سے ایک ہجوم واقف ہوتا ہے لیکن مہاجرت کے دوران انسان جو کچھ جھیلتا ہے، وہ اسے بیان ضرور کرنا چاہتا ہے لیکن ان کے ساتھ جو اسے ہم وطن ہوں۔ ارینا نے فرانس میں اپنی مہاجرت کی آزادی کو لطف کا ذریعہ ضرور بنایا لیکن پراگ اس کے زخموں کو نہ صرف دریافت کرتا ہے بلکہ انھیں ہوا بھی دیتا ہے۔ اس کی حالت وہی ہے جو بقول کنڈیرا اوڈی سیوس کی ہے۔ "وہ اس بات کا منتظر رہا کہ کسی دن وہ اس سے پوچھیں "تم بھی ہمیں کچھ بتاؤ" یہ واحد بات جو انھوں نے کبھی نہ کہی"۔(۶) آدمی اپنے گھر میں واپس آکر بھی اپنے گھر کا نہیں ہوتا۔ ارینا اسی صورت حال کا سامنا کرتی ہے۔ گویا اڈارنو کے الفاظ میں "یہ اخلاق کا حصہ ہے کہ آدمی اپنے گھر میں بھی گھر جیسا محسوس نہ کرے"(۷) گھر محض چار دیواری کا نام نہیں بلکہ ان یادوں سے جڑے ہوئے لوگوں کا نام ہے جو وہاں موجود تو ہیں لیکن باہر سے آنے والے کو محسوس نہیں کرتے۔ ارینا کی واپسی کی خوشی سب کو ہے، وہ اس کے ارد گرد خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ اس کی آمد ان کے پاس مل بیٹھنے کا بہانا ہے۔ وہ اس کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو وہ ہمیشہ اس طرح کی محفلوں میں ایک دوسرے کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ وہ اسے ایک مہمان سمجھتے ہیں جو طویل عرصے بعد اپنے گھر واپس آیا ہو۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ کئی بار "نفاست سے کوشش کرتی ہے کہ بات چیت کو ایسا رخ دیا جائے تاکہ وہ انھیں جو کچھ بتانا چاہتی ہے بتا سکے لیکن وہ ناکام رہتی ہے۔ جونہی اس گفتگو ان کی دلچسپی سے دائیں بائیں ہوتی ہے وہ سننا بند کر دیتی ہے"۔(۸)

اس ہجوم میں واحد شخص جو اس کی ذہنی حالت سے واقف ہے وہ اس کے شوہر کی دوست میلادا ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ مہاجرت سے زیادہ اذیت ناک اپنے لوگوں میں مراجعت ہوتی ہے۔ اپنے لوگوں سے دور رہنا آسان ہوتا ہے، آپ اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔ یادوں کو اپنی ذات میں دفن کر دیتے ہیں۔ اجنبی لوگوں میں آپ کو بولنے کی، مہاجرت کے تجربے کی، اپنے لوگوں کی بات کرنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ لیکن جب آپ، اپنوں میں واپس آجاتے ہیں تو یادیں زخموں کو کرید کر تازہ کر دیتی ہیں۔ ان زخموں پر مرہم کا اختیار صرف اپنوں کے پاس ہوتا ہے۔ اگر مراجعت کے زمانے میں وہ آپ کے تجربے پر بات نہ کریں تو زخم ناسور بن جاتے ہیں۔ یہی اوڈی سس کے ساتھ ہوا اور اسی تجربے سے بیدی کی لاجونتی گزرتی ہے۔ اسے احترام ضرور ملتا ہے لیکن مہاجرت کی

اذیت ناکی پر بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہر کوئی ارینا سے پراگ میں گزرے مہاجرت سے پہلے کے زمانے پر بات کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ انھیں یادوں کو سانجھا کرنا چاہتا ہے جو ان کے ساتھ وابستہ تھیں۔ بیس سال کے وقت سے کسی کو کوئی سروکار نہیں ہے۔ گویا اسے پہلی بار یہ ادراک ہوتا ہے کہ مراجعت، مہاجرت سے زیادہ اذیت ناک ہے۔ دو متضاد تجربات کے حامل لوگ ایک دوسرے کی اذیت محسوس کر ہی نہیں سکتے۔

ارینا جب پراگ چھوڑتی ہے تو کچھ لڑکپن کی یادیں بھی وہیں چھوڑ آتی ہے۔ روسی قبضے سے پہلے کی بے فکر زندگی اور روسی قبضے کے بعد کی پرخطر زندگی، دونوں طرح کی یادیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی اور منقسم بھی ہیں۔ بیسویں صدی میں روسی سامرجیت اور اس کا بیانیہ دونوں پراسرار اور مستحکم ہیں۔ یورپ نے سامراجیت کے اس تصور کو نہ صرف تکریم بخشی بلکہ اسے پروپیگنڈہ کے طور پر استعمال کر کے خود اپنی طرف سے روا رکھے جانے والے جبر سے عوام کو بے خبر رکھا۔ خود کنڈیرا یورپی ہے اور اس کا نعرہ ہے کہ "آمر اپنے انجام کو پہنچ سکتے ہیں پر روس ابدی ہے۔"(۹) یہی تصور اس کے کرداروں کے زہنوں میں بھی راسخ ہے۔ روسی قبضہ ارینا کے دماغ سے پراگ ہی کی خوشگوار یادوں کو منہا کر دیتا ہے۔ ان یادوں کا تعلق اس کے لڑکپن کے دوست جوزف کے ساتھ ہے۔ واپسی کے سفر میں ائرپورٹ پر اس کا سامنا جوزف کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ اسے فوری طور پر پہچان لیتی ہے لیکن وہ اسے نہیں پہچان پاتا۔ جوزف کو بھی اسی قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن سے وہ گزر کے آئی ہے۔ وہ ایک قدیم شناسا کی طرح اس سے باتیں کرتی ہے لیکن وہ ظاہر یہی کرتا ہے کہ اسے پہچان چکا ہے لیکن درحقیقت اسے بالکل نہیں خبر وہ کس سے بات کر رہا ہے۔

جوزف کا تعلق بھی پراگ میں کسی زمانے میں کیمونسٹ پارٹی کے ساتھ تھا۔ روسیوں کی آمد کے بعد اسے بھی جلاوطن ہونا پڑا۔ واپسی پر جب وہ اپنے بھائی اور بھابھی کے ہاں رہنے کو آتا ہے اسے ارینا کی طرح کوئی سننے کو تیار نہیں۔ چہروں اور جگہوں کے ساتھ ساتھ انسانی ذہن بھی بدل چکے ہیں۔ بھائی اس کے ساتھ ان مسائل کا گلہ کرتا جن کا سامنا، اس نے، اس کے جانے کے بعد کیا۔ وہ اسے بتاتا ہے کہ اس کے چلے جانے کے بعد اس کی اشیا پر قبضہ کر لیا گیا۔ حتی کہ اس کے دوست رین کی تصویر بھی ان کے ہتھے چڑھ گئی۔ وہ اپنے بھائی کی کلائی پر اپنی گھڑی دیکھ کر دکھی ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے:

> "اسے لگا اس دنیا میں اس کی آمد ایسے تھی جیسے کوئی مردہ قبر سے بیس سال بعد
> نمودار ہوا ہو۔ جو چلنے کی عادت بھول چکا ہے، جس سے اس کی دنیا چھن گئی ہے
> جس کی چھوڑی گئی اشیاء لواحقین نے آپس میں تقسیم کر لی ہیں"۔(۱۰)

جو بات مہاجر کبھی نہیں سمجھ پاتا وہ یہ ہے کہ پیچھے رہ جانے والوں کے لیے، اس کی واپسی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ وہ ذہنی طور پر یہ قبول کر چکے ہوتے ہیں کہ اب وہ واپس کبھی نہیں آئے گا۔ وہاں سے اس کی موت کی خبر ہی آئے گی۔ سو بچ جانے والی چیزوں کو خوش دلی سے تو کبھی بد دلی سے قبول کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ اچانک واپس آجاتا ہے تو وہ ان کے لیے کوئی دوسرا شخص ہوتا ہے، وہ نہیں جسے انھوں نے کبھی رخصت کیا ہوتا ہے۔ یہی المیہ اوڈی سیس کو بھی درپیش ہے۔ جوزف کو بھی اسی کا سامنا ہے۔ پاس رہنے والے لوگوں کے ہم عادی ہوتے ہیں۔ آتے جاتے ملنا، بات کرنا اور دیکھنا ہمارے روزمرہ معمولات کا حصہ ہوتا ہے۔ دور چلے جانے والے یاد بن کے رہ جاتے ہیں۔ ان سے جب دنوں بعد بات ہوتی ہے یا کبھی کبھار کوئی خط آتا ہے تو ہی ان کے ساتھ گزرے لمحے لاشعور سے کچھ وقت کے لیے ہمارے شعور میں آتے ہیں۔ پھر ہم یہاں کی زندگی کے بہاؤ میں بہتے چلے جاتے ہیں۔

جب وہ بھائی بھابھی سے مل کے ہوٹل واپس آتا ہے تو اسے وہ ڈائری کھولنے کا موقع ملتا ہے جو نکلتے وقت اس کا بھائی اس کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ یہ اس کے لڑکپن کے زمانے کی یادداشتیں ہیں۔ ڈائری میں ایک نوجوان جوزف ہے جسے وہ بمشکل ہی پہچان پاتا ہے۔ ڈائری میں کسی نوجوان لڑکی کا بار بار ذکر آتا ہے جسے وہ ذہن پر زور دے کر بھی یاد نہیں کر پاتا اور بالآخر ڈائری پھاڑ کے پھینک دیتا ہے۔ گویا وہ پراگ کے ماضی کی آخری اور موہوم یاد کو بھی تلف کر دیتا ہے۔ جب یہاں کی جگہوں اور لوگوں نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا ہے تو اس کے لیے یہاں کی کسی بھی یاد کو سینے سے لگائے رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو بات بیان کنندہ اور قاری جانتا ہے لیکن جوزف نہیں جانتا، وہ یہ ہے کہ ڈائری والی لڑکی ارینا کے سوا کوئی اور نہیں۔

وہ اسے دوبارہ ضرور ملنا چاہتا ہے کیوں کہ وہ اپنے لوگوں سے مایوس ہو چکا ہے ایسے عالم میں کسی اجنبی کے ساتھ ہی دل کی بات کی جا سکتی ہے۔ ایک ایسا اجنبی جو اس کے ماضی سے ناواقف ہے۔ جسے اس کے ماضی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شدت سے اس کے فون کا انتظار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے لیے اپنی بیٹی سے ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسے شک گزرتا ہے کہ یہ وہی ڈائری والی لڑکی ہے جو اس زمانے میں اس کی ڈائری کی زینت تو بنی لیکن اس کے ساتھ اس کا تعلق نہ بن سکا۔ بدلا ہوا پراگ روسی زمانہ بھول چکا ہے اور اب انگریزی زبان بولتا ہے گویا سامراج کی نئی اور ترقی یافتہ صورت حال سے اس کا سامنا ہے۔ بیس سال میں جوزف کی یادداشت ارینا کے حوالے سے سلب ہو چکی ہے جب کہ ارینا کی یادداشت کی تجدید ہو گئی ہے۔ سکول کے زمانے میں سکولی بچوں کی معصومانہ جھجک ان کے آڑے رہی۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب اظہار کے راستے میں کئی رکاوٹیں آتی ہیں۔ جلاوطنی کے زمانے میں کیا کچھ ذہن میں رہ گیا ہے اور کیا کچھ باقی ہے، یہ ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ جلاوطنی پرانی محبتوں کو ہڑپ لیتی ہے۔ ان کی یاد توڑہ جاتی ہے لیکن نئے زمانے میں انسان نئے رشتے تلاشتا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے داستانوں کے شہزادے، یہاں تک اتھاکا کا ہیرو اوڈی سیس بھی ۔ مراجعت ہی وہ مظہر ہے جو مندمل زخموں کو ہرا کرتی ہے۔ ارینا کی واپسی پہ اسے کوئی سننا نہیں چاہتا، جوزف بھائی بھابھی سے مایوس ہے۔ ایسے عالم میں انسان سہارے کی تلاش میں نکلتا ہے۔ اگر ان کے اپنے انھیں خوش دلی سے قبول کرتے۔ ان کی کہانی سنتے۔ ان کے دل کا بوجھ ہلکا کرتے۔ انھیں ویسے ہی اپنا لیتے جیسے وہ جلاوطنی سے پہلے تھے تو عین ممکن ہے انھیں ایک دوسرے کی طلب نہ ہوتی۔

دونوں کی زندگیوں میں مماثلت ہے۔ دونوں مہاجر ہیں۔ دونوں بیس سال بعد واپس آئے ہیں۔ ارینا، مارٹن کی موت کے بعد اس کی یادوں سے ویسے فرار ہونا چاہتی ہے جیسے پراگ کی زندگی کو فراموش کرنا چاہتی ہے جب کہ جوزف اپنی بیوی کے مرنے کے بعد کوشش کر کے اس کی یادوں کو زندہ رکھنا چاہتا ہے لیکن یہی اس کی اذیت کا سبب بھی ہے۔ گویا "ذہن میں اسے زندہ کرنے کی سب کوششیں جلد ہی اذیت میں بدل گئیں۔" (۱۱) یادداشت کی اپنی ہی کیمسٹری ہے۔ یہ آزادانہ کام کرتی ہے۔ انسان اس کے اختیار میں ہوتا ہے۔ اس نے اپنی دنیا میں کسے جگہ دینی ہے اور کسے دور کرنا ہے، کب تک ماضی کو دبا کے رکھنا ہے اور کسے معدوم کرنا ہے، مکمل طور پر اس کے اختیار میں ہوتا ہے۔ بسا اوقات غیر معمولی اور لمحاتی واقعات ہمارے دماغ سے محو ہو جاتے ہیں اور کبھی بظاہر عام سے واقعات اور لوگ ہمارے ذہن میں مستقل ٹھکانہ بنا لیتے ہیں اور ہم باوجود کوشش کے ان سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ جوزف اپنی بیوی کی قبر پہ جاتا ہے لیکن وہاں جا کر بھی اسے دکھ کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔

دوسری طرف پراگ کی سڑکوں پر چہل قدمی کرتی ارینا کے لیے، موجودہ پراگ ایک اجنبی دنیا ہے۔ گویا وہ یہاں آ کر مہاجرت اور مراجعت دونوں کے طرح کے تجربات سے بیک وقت گزرتی ہے۔ مراجعت کی اذیت کی معراج کا نظارہ کرنا ہو تو حوان رلفو کا ناول پیڈرو پرامو دیکھیے، اس سے زیادہ پر اثر ناول کی مثال عالمی ادب میں شاید ہی ملے۔ مرکزی کردار جن جگہوں اور

لوگ سے واقف تھا وہ مرکھپ چکے ہیں۔ ان کی ٹھوس یادیں اب بھی اس کے ذہن میں زندہ ہیں۔ عمارتیں، گلیاں، بازار اور درخت جن کے ساتھ وہ کبھی پلا بڑھا تھا، وہ ناپید ہو چکے ہیں یا ان کی صورتیں بدل چکی ہیں۔ اس کے نزدیک ماضی حال سے زیادہ زندہ ہے یہی وجہ ہے کہ اسے آوازیں اور سائے انہی لوگوں کے سنائی اور دکھائی دیتے ہیں لیکن اس کے سامنے جو لوگ آجا رہے ہیں وہ کوئی اور ہیں۔ گویا سب کچھ گڈمڈ ہو چکا ہے۔ یہی عالم ارینا کو درپیش ہے۔ وہ جگہ جگہ رک کر پرانے ٹھکانے اور لوگوں کو ذہن میں لانے کی سعی کرتی ہے۔ ماضی اس کے ذہن کی سکرین پر لمحوں میں آتا ہے اور غائب ہوتا چلا جاتا ہے۔ فرانس جو کبھی مہاجرت کے اولین دنوں میں اس کے لیے ایک اجنبی سرزمین تھا، جسے اس نے بمشکل قبول کیا، اپنایا اور پراگ کو ذہن کے کسی گوشے میں ہمیشہ کے لیے دفن کیا۔ اب جب وہ سالوں بعد پراگ لوٹی تو اس سرزمین نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ایک الگ ہی قسم کا تجربہ تھا یہاں آکر "وہ سوچتی ہے پراگ سے زیادہ کوئی مقام اس کے لیے اجنبی نہ رہا ہو گا۔"(۱۲)

اجنبیت کا یہ احساس اس اجنبیت سے مختلف ہے جس کا سامنا اسے پہلے پہل فرانس میں جا کے کرنا پڑا تھا۔ پراگ میں سارے اپنے ہیں۔ سب اسے جانتے ہیں لیکن بیس سال بعد کی مراجعت کے بعد کوئی اسے جاننے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہی عالم جوزف کا ہے۔ پراگ آکر اپنوں کی بے اعتنائی کی وجہ سے اسے ڈنمارک کی یاد ستانے لگتی ہے۔ وہ جو ڈنمارک جا کر چیک بولنا بھول چکا تھا اب اس کے لیے چیک زبان میں بات کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اپنے بھائی بھابھی کے ساتھ ان کی زبان میں بات کرنا اس لیے دقت طلب کام ہے کہ اسے ان کے لب و لہجے میں اجنبیت کی بو آتی ہے۔ جونہی وہ اپنے بے تکلف دوست این سے ملتا ہے وہ فر فر چیک بولنے لگتا ہے۔ "اس زبان میں گفتگو سے اس نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ بات کرتے اسے محسوس ہوا جیسے وہ محو پرواز ہو۔ اپنی آمد کے بعد وہ پہلی بار اپنے ملک میں خوشی سے ہم کنار ہوا اور اسے یہ اپنا محسوس ہوا۔"(۱۳)

گویا محبت کی زبان ہی مشترکہ ہوتی ہے۔ احساس اور دوسرے شخص کے باطنی کرب کو محسوس کرنے کا نام محبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ارینا سے ملنا چاہتا ہے۔ دونوں کردار مہمانوں کی طرح اپنی زمین کی طرف لوٹتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی بے نیازی کی وجہ سے اپنی ہی سرزمین پر اجنبی ہو جاتے ہیں۔ ان کی ملاقات ہوتی ہے۔ گویا دو مہاجر دو مختلف دنیاؤں سے ایک دوسرے کے لیے یہاں پہنچے۔ ان کے درمیان پنپنے والے اس رشتے کا کوئی نام نہیں ہے۔ ان کی یہ پہلی اور آخری ملاقات ہے۔ جوزف جانتا ہے کہ یہ اس کا گھر نہیں ہے اور ارینا بھی۔ جوزف تو اپنے دوست کی بیوی سے باقاعدہ اظہار بھی کرتا ہے کہ وہ اپنے گھر لوٹ جائے گا تو وہ حیران ہو کے پوچھتی ہے کون سا گھر تو اس کا جواب ڈنمارک ہوتا ہے۔ کوئی شخص اتنی آسانی سے اپنی جنم بھومی کو کیسے فراموش کر سکتا ہے۔ جو بات اس کے دوست کی بیوی نہیں سمجھ پاتی وہ یہ ہے کہ پراگ نے اسے قبول ہی نہیں کیا تو اس کے پاس دوبارہ مہاجرت کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس ناول میں جو دو لوگ کھل کے دل کی بات کرتے ہیں وہ جوزف اور ارینا ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے اپنے تجربات اور رویوں کو موضوع بحث بناتے ہیں بلکہ وہ ان کی طرف سے توجیہات بھی خود ہی پیش کرتے ہیں۔ ایک ہی طرح کے تجربات سے گزرنے والے لوگوں کے لیے ایک دوسرے کو سمجھنا اور محسوس کرنا آسان ہوتا ہے۔ عین ممکن ہے وہ ڈنمارک میں وہی خواب دیکھتا ہو جو وہ فرانس میں دیکھا کرتی تھی۔ ان دونوں کی یہ اتفاقیہ ملاقات ہی درحقیقت ان کی مراجعت کا حاصل ہے۔ مراجعت نے ان دونوں کو جن نئی اذیتوں اور یادوں کو تازہ کیا، انھیں انھوں نے وصل کے ناقابل فراموش لمحوں میں بہا دیا۔

"اپنے ناولوں میں کنڈیرا کسی کلاسیکی ڈرامے یا ناول سے تخلیقی سطح پر استفادہ کرتا ہے۔ قدیم تمثیل کو نیا چولا پہنا کر اس کی معنویت میں جدت لے آتا ہے۔ وہ ان

متون کا اظہار ناولوں میں اس سلیقے سے کرتا ہے کہ ناول کے کیمیاوی عمل کا حصہ بنا دیتا ہے۔"(۱۴)

اس ناول میں وہ اوڈی سیس سے شروع کرتا ہے اور مراجعت کو ایک کائناتی مسئلہ بنا دیتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ عہد قدیم کے انسان کے پاس مراجعت کے بعد دوبارہ مہاجرت کے لیے وقت نہیں تھا لیکن جدید عہد کا انسان جدید مسافرت کے ذرائع استعمال کر کے ایسے ٹھکانوں سے دور جا سکتا ہے جہاں اس کی قدر نہیں ہے۔ اس ناول کے دونوں کردار دو مختلف ملکوں سے سفر کر کے ایک دوسرے سے اولین ملاقات کے لیے پہنچے اور یادوں کی تازہ کاری کے ساتھ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ جیسے کوئی ماضی نہ ہو اور نہ ہی مہاجرت اور مراجعت کا کوئی وجود ہو۔ ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ تعلق سے زیادہ قیمتی کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ میلان کنڈیرا کے ناول عہد جدید میں زوال آمادہ انسانی تعلقات کو سنبھالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسی بے مثال کاوش ہمیں دوسرے کسی بھی ناول نگار کے ہاں اس شدت سے نظر نہیں آتی۔

حوالہ جات

1.Edward W. Said, Reflections on Exile and other Literary and Cultural Essays, Granta Books, London,2001, P 174

2. Ibid, P173

۳۔ غسان کنفانی، حیفا کی طرف واپسی، مترجم اسد اللہ امیر حسینی، لاہور، کولاج پبلی کیشنز، ۲۰۲۶ء، ص:۱۵

۴۔ ڈاکٹر ظہیر عباس، خندہ اور فراموشی کی کتاب: تخلیقی اصطلاع سازی اور بیانیے کا تغیر، لاہور، جی سی یو، تحقیق نامہ: شمارہ ۳۶، ۲۰۲۵، ص:۲۶

۵۔ میلان کنڈیرا، مراجعت، مترجم، حمید رازی، لاہور، سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص:۱۵

۶۔ ایضاً، ص:۲۰

7. Daniel Boscaljon(Edited), Resisting The Place of Belonging, (New York: Routledge, Taylor&Francis Group,2016, P:1

۸۔ مراجعت، ص:۲۳

۹۔ ایضاً، ص:۱۰

۱۰۔ ایضاً۔ ص:۳۸

۱۱۔ ایضاً، ص:۶۴

۱۲۔ ایضاً، ص:۶۷

۱۳۔ ایضاً، ص:۷۷

۱۴۔ ڈاکٹر ظہیر عباس، پہچان، عہد جدید میں محبت کی تجدید نو کا استعارہ، فیصل آباد، جی سی یو، زبان و ادب، جلد ۲، شمارہ ۱۸، ۲۰۲۵، ص:۳۱

References in Roman Script:

1. Edward W. Said, Reflections on Exile and Other Literary and Cultural Essays, Granta Books, London, 2001, p. 174.
2. Ibid., p. 173.
3. Ghassan Kanafani, Haifa Ki Taraf Wapsi, Mutarjim: Asadullah Ameer Hussaini, Lahore, Collage Publications, 2026, p. 15.
4. Dr. Zaheer Abbas, Khanda Aur Faramoshi Ki Kitab: Takhleeqi Istilah Sazi Aur Bayaniye Ka Taghayyur, Lahore, GCU, Tahqiq Nama, Shumara 36, 2025, p. 26.
5. Milan Kundera, Murajaat, Mutarjim: Hameed Razi, Lahore, Sanjh Publications, 2010, p. 15.
6. Ibid, p. 20.
7. Daniel Boscaljon (ed.), Resisting the Place of Belonging, New York: Routledge, Taylor & Francis Group, 2016, p. 1.
8. Murajaat, p. 23.
9. Ibid, p. 10.
10. Ibid, p. 38.
11. Ibid, p. 64.
12. Ibid, p. 67.
13. Ibid, p. 77.
14. Dr. Zaheer Abbas, Pehchan: Ahd-e-Jadeed Mein Mohabbat Ki Tajdeed-e-Nau Ka Istiara, Faisalabad, GCU, Zaban-o-Adab, Jild 2, Shumara 18, 2025, p. 31.